سلطان شاہ اور ویرا کے ساتھ سوار ہوگیا۔ دونوں ٹیکسیاں آگے پیچھے نوم پنہہ انٹرنیشنل ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئیں۔

''ہوٹل میں پاسپورٹ کا کیا مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا؟'' راستے میں جلال نے پوچھا۔

ہوٹل سے الگ الگ ٹکڑیوں میں روانہ ہونے کی تجویز کو اس نے میری احتیاط پر محمول کیا تھا۔ وہ پورے قصے سے بے خبر تھا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ دیر تک ہنستا رہا۔ اسے حیرت تھی کہ میں نے کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے اپنے پانچویں سالگرہ کے پکڑے جانے کی کہانی کیسے گھڑلی۔ وہ کہانی بے داغ تھی۔ ایک سے زیادہ پاسپورٹ رکھنا ہمیشہ سے جرم ہے۔ جرم کی تردید کے لیے یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ بقیہ پاسپورٹ غلطی سے رہ گئے تھے۔ ثبوت کے طور پر ہر فاضل پاسپورٹ کے حامل متعلقہ حکام کے پاس پیش ہونا ضروری تھا۔

''ایسی باتیں آرام دہ بستر میں سکون سے لیٹ کر سوچی جاسکتی ہیں۔ بگڑے ہوئے حالات میں ان کا کسی عام ذہن میں آنا محال ہے'' اس نے ہنستے ہوئے کہا ''الجھن یا پریشانی کی صورت میں انسان کی رہی سہی عقل بھی ماؤف ہوجاتی ہے۔''

''سرحدی تجربات تازہ تھے۔ میں نے ان سے فائدہ اٹھالیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں شروع سے دیکھتا چلا آرہا ہوں کہ دیکھی اور سنی ہوئی ہر بات تمہارے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ ضرورت پڑتی ہے تو یہ سب تمہیں بروقت یاد آجاتا ہے۔''

''اس میں میری کسی کوشش کا دخل نہیں ہوتا۔ سب کچھ خود بہ خود ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب ہمارا مراجعت کا سفر شروع ہوگیا ہے۔ ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اب ڈی این اے کی تصدیق کا مرحلہ کب سر ہوگا؟ تم ہدایات کب دو گے؟''

''ہوٹل سے نکلتے ہی وہ پہلا کام تھا جو میں نے کر ڈالا۔ فون پر ہدایات دے دی ہیں۔ اوکاڑہ میں میرے آدمی تیار تھے۔ وہ آج ہی گداگر کے جسم سے سیمپل لے کر کراچی روانہ کردیں گے۔ یہ سمجھ لو کہ تمہاری خودکشی کا ڈراما میرے کیریر کا سب سے بڑا جوا ہے۔ میں اس کے لیے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ صرف تمہاری رضامندی ضروری تھی۔''

''میں کبھی وہاں نہیں گیا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا ''مگر میرا اندازہ ہے کہ اوکاڑہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں جدید طبی سہولتیں عنقا ہوں گی۔''

''وہ ایسی ہی جگہ ہے۔'' اس نے میری تائید کی ''اس شہر کی اہمیت اس چھاؤنی کی وجہ سے ہے جو آبادی سے بارہ کلومیٹر پرے ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ چھاؤنی کے کمبائنڈ ملٹری اسپتال کے کمانڈنگ آفیسر سے میں بات کر کے آیا تھا۔ میرے آدمی جس وقت بھی مطلوبہ شخص کو لے کر اوکاڑہ کینٹ کے سی ایم ایچ پہنچیں گے۔ ذرا سی دیر میں سیمپل لے کر محفوظ کرلیا جائے گا۔ یہ سارے پہلو میری نظروں میں تھے۔''

''امریکا سے رپورٹ آنے میں کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت تک میری پوزیشن کیا ہوگی؟ ڈسنے والے اندیشے ایک مرتبہ پھر میرے دماغ میں سر ابھار رہے تھے۔

''تم فکرمند کیوں ہورہے ہو۔ میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ اب تم ڈینی نہیں قمر علی ہو، ایک نیا نام، ایک نئی شخصیت!''

''یہ سوچ کر دل اداس ہوجاتا ہے کہ اب نام بھی میرا اپنا نہیں رہے گا۔ بس ایک تڑپ ہے زخم سہنے کی ہمت دے رہی ہے کہ اب میں اپنے وطن، اپنے گھر لوٹ جاؤں گا۔''

''نہ، نہ..... یہ نہ سوچنا'' اس نے تیزی سے کہا ''تم اپنے وطن ضرور لوٹ رہے ہو مگر بھول کر بھی اپنے گھر کا رخ نہیں کرو گے۔ وہ ڈینی کا گھر ہے جو خودکشی کر چکا ہے۔ اسے سرکاری تحویل میں لے کر نیلام کردیا جائے گا۔ رقم کسی نہ کسی طرح تم تک پہنچ جائے گی۔ یہ مہینوں بلکہ سالوں کی کہانی ہوگی۔ اب تم ایک نئے گھر میں بہت سکون سے اپنی نئی زندگی کی ابتدا کرو گے، جہاں کوئی ہاتھ تمہاری طرف نہیں اٹھ سکے گا۔''

مجھے اپنے معدے میں گرہیں سی پڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ مجھے جہانگیر یاد آگیا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا ''میں جہانگیر اور سلمیٰ سے تو مل سکوں گا نا؟''

''نہیں!'' جلال کی آواز سرد اور سپاٹ ہوگئی ''بہ ظاہر نام بدل لینا بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن تم نے ایک بہت مشکل مگر اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تمہارے حق میں وہ بیم کن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔ اس پر نگاہیں لگی رہیں گی۔ تم کوہر ایسی چیز اور فرد سے دور رہنا ہوگا جس کے ذریعے تمہاری شناخت ہوسکے۔ تم خوش اخلاق اور ملنسار ہو۔ بہت جلد اپنے نئے دوست بنالو گے۔''

''تو کیا تم بھی میرے لیے شجر ممنوعہ بن جاؤ گے..... اول خان کا کیا ہوگا؟ یہ تنہائیاں تو مجھے کھا جائیں گی، یہ سب میرے گمان میں بھی نہیں آسکا تھا۔''

''دیکھو، تم پھر جذباتی ہورہے ہو۔ ہماری بات دوسری ہے۔ ہمارے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں، ہم سیکڑوں لوگوں سے ملتے ہیں۔ ہم ڈینی کی شناخت نہیں ہیں۔ تم سے

Downloaded from https://paksociety.com

ملتے جلتے رہیں گے۔ جہانگیر کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ تمہارا جگری دوست ہے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہے۔ تمہارے دوست اور دشمن، سب جانتے ہیں کہ صرف تم اس سے ملتے ہو۔ تم نے ادھر کا رخ بھی کیا تو مشکلات کا آغاز ہوجائے گا۔''

''کڑی پابندیاں ہیں نام بدلنے کی۔'' میں نے ایک گہرا سانس لے کر تھکی ہوئی آواز میں کہا ''امریکی کتوں نے مجھے اپنی مٹی پر اجنبی بننے پر مجبور کردیا ہے۔ مجھے چوروں کی طرح اپنے ماضی سے بالکل کٹ کر نئی زندگی گزارنی ہوگی۔ کاش! میری دعا قبول ہو، میں ایک بیٹے کا باپ بن جاؤں پھر میں بیس برس بھی انتظار کرلوں گا۔ میں نے قانون سے ماورا جنگ لڑی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو قانون کے رکھوالوں میں شامل کروں گا۔ میرے خون کو قانون کی طاقت اور پشت پناہی حاصل ہوگی تو وہ ان کتوں سے میری ساری محرومیوں کا حساب چکا لے گا۔''

''میری دلی دعا ہے کہ اللہ تمہیں نرینہ اولاد عطا کرے۔'' وہ بولا۔

ٹیکسی میں کچھ دیر کے لیے روح کو کاٹنے والا سکوت چھا گیا۔ شاید کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔ آخر میں نے ہی وہ سکوت توڑا۔ سوال میرے ذہن میں بگولوں کی طرح چکرانے لگے تھے۔ ''میرا گھر نہیں ہے تو میں کراچی پہنچ کر کہاں جاؤں گا؟''

''میرے محکمے کا آرام دہ ریسٹ ہاؤس تمہاری واپسی کا منتظر ہے۔ جب چاہو، تم اپنی پسند کا کوئی مکان خرید لینا۔'' اس کی آواز پست ہوگئی۔

''مکان خرید لینا۔'' میں نے استہزائی لہجے میں اس کے کہے ہوئے آخری الفاظ دہرائے پھر کہا ''شاید تم کو علم نہیں کہ میری ساری پونجی جہانگیر کی بیوی کے پاس امانت ہے۔ مجھے ان سے ملنے کی ممانعت ہے۔ ان کے لیے میں خودکشی کرچکا ہوں.....''

''تم اپنے ذہن پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال رہے ہو۔ یہ تمہارے مسائل نہیں ہیں۔ تم بھول گئے کہ ہم اوپر کی ہدایت پر سرکاری حیثیت میں آئے ہیں تاکہ تمہیں باور کراسکیں کہ اب تمہاری ہر ضرورت کو پورا کرنا ریاست کے ذمے ہوگا۔ تم امریکیوں سے نالاں ہو، ٹھیک ہے۔ ٹھنڈے دل سے یہ بھی سوچو کہ تمہارا ملک تمہاری خدمات کا کیسا کھلا اعتراف کررہا ہے۔''

جلال کے حساب کتاب میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ اپنا پورا ہوم ورک کرکے کراچی سے روانہ ہوا تھا۔ وہ خود وقت اور حالات کے دھارے پر بہہ رہا تھا۔ سامنے آنے والی ٹھوس زمینی حقیقتوں کو لوٹانا اس کی بساط سے باہر تھا۔ اس سے جو کچھ ممکن تھا، وہ کررہا تھا۔ اس کی ذات سے ان ہونی باتوں کی توقع عبث تھی۔

ٹیکسی آہستگی سے رک گئی۔ میں جلال سے باتوں میں اس طرح الجھا رہا کہ مجھے یہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہم ایئرپورٹ کی حدود میں داخل ہوئے اور کب دونوں ٹیکسیاں لاؤنج کے سامنے پہنچ گئیں۔

ٹیکسی سے اترنے تک میرے دل و دماغ کا ابال کچھ ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ جب میں نے سلطان شاہ کو بہت محبت کے ساتھ ویرا کا بازو تھام کر گاڑی سے اتارتے ہوئے دیکھا تو میرا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔ دل سے رہی سہی کلفت بھی زائل ہوگئی۔

دوسری ٹیکسی میں آنے والوں کو میرے اور جلال کے مذاکرات کا کوئی علم نہیں تھا۔ سب پاکستان واپسی کے خیال سے نہال تھے۔ سلطان شاہ اور ویرا کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے پوری دنیا کا چکر لگانے کے بعد آخر کار ایک دوسرے کی صورت میں اپنی زندگی کے ہم سفر پالیے تھے۔

ٹریفک کے ہجوم اور فاصلے کی وجہ سے اس سفر میں کافی وقت ضائع ہوگیا تھا۔ پھر بھی ہم متعلقہ کاؤنٹر کھلنے سے چند منٹ پہلے ہال میں پہنچ گئے۔

ہم میں سے کسی کے پاس زیادہ اسباب نہیں تھا۔ جلال ہمیں چھوڑ کر کاؤنٹر کی طرف گیا تو میں اول خان کو اپنے ساتھ لے کر دوسروں سے الگ ہوگیا۔

''تم پاکستان سے آئے ہو، ابھی تک جہانگیر کی کوئی خیر خبر نہیں سنائی۔'' میں نے علیحدگی میں اس سے شکوہ کیا۔

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور بولا ''میں دانستہ اس کا ذکر کرنے سے کترا رہا تھا۔ تمہاری خودکشی کی خبر پر اس کا حال بہت ابتر ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا ..... میری خودکشی کا واقعہ کتنا پرانا ہے؟''

''جلال نے سب کچھ بہت تیزی سے ایک ساتھ کر ڈالا۔'' وہ بتانے لگا ''اس قیدی کی خودکشی کا واقعہ پرانا نہیں ہے۔ یہ پرسوں شام کی خبر ہے۔ میں کل اپنے باس کے حکم پر گوادر سے کراچی پہنچا تو اخبارات کے پہلے صفحے پر وہ سنسنی خیز خبر نمایاں تھی۔ میں جلال کے کھیل سے واقف تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم صدف مینشن کے قیدی بنو۔ تمہارے شبہے میں دو

Downloaded from https://paksociety.com

آدمیوں کی گرفتاری اور باز پرس کی خبریں کئی روز سے آ رہی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تم بنکاک میں ہو۔ مجھ پر نئی خبر کا کوئی اثر نہیں ہوا مگر مجھے جہانگیر کی فکر تھی۔ پہلے میں جلال سے ملا۔ اس نے اپنے منصوبے کے بارے میں مجھے پوری بریفنگ دے ڈالی۔ ہماری روانگی میں وقت باقی تھا۔ میں نے دلاسا دینے کے لیے جہانگیر کو فون کیا تو وہ پھٹ پڑا۔ میری آواز سنتے ہی ایسا پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ میرا دل پانی ہوگیا۔ وہ تمہیں اپنا دوست، مربی، باپ اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کے بین سے میرا دل پھٹ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے جانے سے وہ یتیم ہوگیا۔ شدید خواہش کے باوجود میں اسے یہ بتانے کی ہمت نہیں کر سکا کہ تم زندہ ہو۔ تمہاری خودکشی ایک سوچا سمجھا ڈراما ہے۔''

''وہ واقعی مجھے یاد کر کے برسوں روئے گا۔'' میں نے اداسی سے کہا ''اس کی شراب نوشی بڑھ جائے گی۔ اسے کوئی نہیں سمجھا سکے گا۔ وہ میری دوستی پر بہت ناز کرتا ہے۔''

''دل چھوٹا نہ کرو۔ وقت سدا ایک جیسا نہیں رہتا'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا ''ظلم و تکبر کا یہ دور بھی نہ بھی ختم ہوگا اور تم اپنے دوستوں میں پہنچ جاؤ گے۔''

''امید.....'' میں نے زہرخند کے ساتھ کہا ''یہ امید ہی انسان کو زندہ رکھتی ہے ورنہ اور کیا رکھا ہے زندگی میں۔ تم نے جلال کو جہانگیر کے بارے میں بتا دیا تھا؟''

''ایک ایک لفظ بتا دیا تھا۔'' اول خان نے پرزور لہجے میں کہا ''جہانگیر کا حال سن کر وہ بھی آزردہ ہوگیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تمہاری دوستی اور دشمنی، دونوں میں شدت کی انتہا ہوتی ہے۔ دوست تمہارے لیے روتے ہیں، دشمن تمہارا خون پی جانا چاہتے ہیں۔''

''وہ بہت گہرا اور گھنا ہے'' میں نے پُرخیال آواز میں کہا ''راستے میں اس سے جہانگیر کے بارے میں کافی باتیں ہوئی ہیں لیکن وہ جہانگیر کے صدمے کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں لایا۔''

''وہ ذہین ہے، جانتا تھا کہ وہ سب سن کر تمہیں خوشی نہیں ہوگی۔''

اسی لمحے جلال لپکتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔ کاؤنٹر کھل چکا تھا۔ وہ جلد از جلد کارروائیوں سے گزر کر بورڈنگ لاؤنج میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

کاؤنٹر پر اس وقت تک صرف ہم لوگ تھے۔ شاید وہاں سے جانے والے سامان سے لدے پھندے ہوتے ہوں گے۔ لڑکی کو حیرت ہوئی کہ چھ کا گروپ ہونے کے باوجود ہمارے پاس ہلکے پھلکے دستی سامان کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

جلال کی پھیلائی ہوئی ہڑبونگ میں غزالہ کا ناشتہ رہ گیا تھا۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ میں سب کو لے کر بورڈنگ لاؤنج کے کیفے میں پہنچ گیا۔ جہاں ہم بورڈنگ کا اعلان ہونے تک سکون سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

سب کے کان پیجنگ سسٹم پر وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کمبوڈین لہجے میں بولی جانے والی انگریزی کو ہلکی سی گونج نے دو آتشہ کر دیا تھا جس سے ہمارے کان مانوس نہیں تھے پھر بھی پرواز کا نمبر سمجھ میں آ رہا تھا۔

ہر اعلان کے بعد لاؤنج میں بھرے ہوئے مسافروں کی ایک بڑی کھیپ اٹھ کر کسی دروازے کے سامنے صف آرا ہوتی اور دروازے کے پار غائب ہوجاتی۔ نئے آنے والے ان کی جگہ لے لیتے۔ مسافروں کی تعداد سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نوم پنہہ کا بین الاقوامی ہوائی اڈا خاصا مصروف رہتا تھا۔

آخر کار ہماری بورڈنگ کی ہدایت بھی آ گئی۔ وہ اعلان سنتے ہی اول خان افسردہ لہجے میں بولا ''بگل بج گیا..... کوچ ہونے والا ہے، یہاں ڈینی کا باب بند ہوگیا۔''

جلال نے عجیلی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ اس وقت ہر قسم کی جذباتی گفتگو سے پرہیز کرنا چاہ رہا تھا۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کر کے اپنے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہمارے طیارے نے رینگتے رینگتے یکایک پوری قوت سے دوڑ لگا کر زمین چھوڑ دی۔

سنگراہنوں کی سرزمین سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ڈان، چاؤ فان، بھوم فاٹ، مادام لی سیاؤ فینگ اور اس کی فتنہ انگیز ادائیں، کوئی..... سب کچھ پیچھے، بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ہم بلندی پر ہانگ کانگ کی طرف اڑے جا رہے تھے جہاں سے ہمیں اپنی اگلی منزل کے لیے روانہ ہونا تھا۔ وہ وہی منزل تھی جس کے لیے پچھلی رات تک میرا دل بار بار تڑپ رہا تھا۔

جلاوطنی ختم ہوگئی تھی۔ پورا کارواں وطن واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆

مین ریلوے لائن پر ساہیوال اور اوکاڑہ کے درمیان گیمبر کا چھوٹا سا اسٹیشن آتا ہے جس کے مختصر پلیٹ فارم پر ہر وقت دھول اڑتی رہتی ہے۔ مخصوص مال گاڑیوں کے علاوہ کوئی میل یا ایکسپریس ٹرین یہاں نہیں رکتی، تیز دھول بچھاتی ہوئی، پٹڑیوں کے ساتھ بنی ہوئی جھونپڑیوں اور کچے مکانوں کے قریب سے گزرتی چلی جاتی ہے۔

اسٹیشن کے ایک طرف گرانڈ ٹرنک روڈ ہے جس کے

Downloaded from https://paksociety.com

ساتھ دور تک اوکاڑہ چھاؤنی کا فوجی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ ریلوے لائن کے پار بسی ہوئی بستی کا نام گمبر ہے جہاں عیسائی اقلیت کی کچھ تعداد بھی ایک قبیلے کی صورت میں رہتی ہے۔ وہ مسلمانوں سے الگ تھلگ لیکن حسن سلوک کے ساتھ رہتے بستے ہیں۔ گمبر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

آبادی سے آگے کھیت ہی کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان میں نے اپنی نئی دنیا بسائی ہوئی ہے۔ میرے پاس گاڑی بھی ہے اور زرعی زمین بھی جہاں گمبر اور اس کے قرب وجوار میں رہنے والے ہاری کام کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں غزالہ کی محبت کی اسیر ہیں۔ روز ہی دو چار ہمارے گھر چلی آتی ہیں اور غزالہ کو پھلی بھی نہیں پھوڑنے دیتیں۔ گھر کے سارے کام کاج کرنے کے ساتھ میرے دو سالہ بیٹے شمشیر علی کو کسی نازک پھول کی طرح ہاتھوں ہاتھ رکھتی ہیں۔

کبھی کبھی میں غزالہ اور شمشیر کو گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر اوکاڑہ کی طرف نکل جاتا ہوں جہاں وہ خستہ تن اور بدحال گداگر لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کیے رہتا ہے جس کے استخوانی بدن سے چرائے ہوئے چند ریشوں نے ہمیشہ کے لیے ڈینی کا نام امریکیوں کے ریکارڈ سے خارج کر دیا۔ میرے خلاف کھلی ہوئی فائلیں بند ہو چکی ہیں اور میں اس زرعی ویرانے میں قمر علی کے نام سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب شمشیر ہوش سنبھالے گا اور میں اسے اپنی زندگی کے کھوئے ہوئے باب سنا سکوں گا۔

جب جاتا ہوں، اس گداگر کو اتنا کچھ دے آتا ہوں کہ وہ چند دن بے فکری سے گزار سکے لیکن دوبارہ جاتا ہوں تو اسے پھر اسی حال میں پاتا ہوں..... ہاتھ پھیلائے ہوئے۔ نہ جانے وہ میرے دیے ہوئے پیسوں اور کپڑوں کا کیا کرتا ہے۔

میرے لیے کراچی میں اچھوت بن کر رہنا ناممکن تھا۔ وہ کرب میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے جلال کے محکمے کے ریسٹ ہاؤس میں رہتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی کسی دور افتادہ اور گم نام مقام پر گزاروں گا۔ غزالہ کو وہیں چھوڑ کر میں نکلا اور پشاور کا ٹکٹ خرید کر خیبر میل میں سوار ہو گیا۔ میل کے نام پر سسک سسک کر سفر طے کرتی ہوئی گاڑی مجھے بہت پسند آئی کیونکہ اس کے ذریعے مجھے راستے کے چپے چپے کو غور سے دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔

گمبر پر میری نظر ٹھہر گئی۔ ٹرین وہاں نہیں ٹھہری۔ اوکاڑہ اتر کر میں نے دو دن ان اطراف میں لگائے اور جلال کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اگلے ایک ہفتے میں میرے لیے اس گھر کا بندوبست ہو گیا۔

ویرا کے تیور نکاح ہوتے ہی بدلے بدلے سے نظر آنے لگے تھے۔ وہ ایسی شوہر پرست نکلی کہ کراچی پہنچنے کے دوسرے روز سلطان شاہ کے ساتھ اس کے گاؤں روانہ ہو گئی۔ ان دونوں کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ جلد از جلد کراچی سے دور چلے جائیں۔ وہ کئی بار میرے پاس آ چکے ہیں۔ کئی کئی دنوں تک ہم چاروں ایک کمرے میں بند ہو کر ماضی کی اچھی اور بری یادوں کے سحر میں کھوئے رہتے ہیں۔ وہ اپنے گاؤں لوٹ جاتے ہیں تو میں پھر ڈینی سے قمر علی بن جاتا ہوں، جس کے بینک اکاؤنٹ میں ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہ جانے کہاں سے بیس ہزار روپے جمع ہو جاتے ہیں جو ہم تینوں کے مختصر خاندانوں کے لیے کافی سے زیادہ ہوتے ہیں۔ فصلوں کی آمدنی جمع ہوتی رہتی ہے جو اللہ نے چاہا تو شمشیر کی تعلیم و تربیت کے اخراجات پورے کرنے کے کام آئے گی۔

کراچی سے گمبر آ کر ایک بڑا سکھ ملا ہے۔ جلال اور اول خان بے خوف ہو کر ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔ کراچی کی طرح یہاں دیواروں کے کان نہیں ہوتے۔ ان کے لیے میں پرانا ڈینی ہوتا ہوں۔ ان ملاقاتوں میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کوئی کھوئی ہوئی چیز پا لی ہو۔

مجھے بس ایک قلق ہے کہ میں اب تک جہانگیر سے ملنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میرا بیٹا کچھ بڑا ہو کر بولنے اور سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ اس وقت میں اسے اور غزالہ کو ساتھ لے کر جہانگیر کے گھر ضرور جاؤں گا تاکہ شمشیر بچپن ہی سے یہ جان سکے کہ اس کا باپ کن لوگوں کی عزت کیا کرتا تھا۔ وہ باتیں اسے ذہن نشین کرا دی گئیں تو وہ بڑا ہو کر بھی اپنے ان بزرگوں کا احترام کرے گا جنھوں نے اس دھرتی کی آن کے لیے اپنا بہت کچھ قربان کر دیا۔

میری طرح جہانگیر بھی ایک بیٹے کا باپ تھا۔ اس کا لخت جگر شیر خواری کے دنوں میں دشمنوں کے ہاتھوں اغوا کے بعد لاہور میں اپنے ننھیال میں پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ شمشیر سے کئی سال بڑا اور ہوشیار تھا۔ ان دونوں بچوں کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ان کے بڑوں نے اپنی مٹی کا قرض کیسے چکایا ہے۔ یہ کام ہم مل جل کر ہی کر سکتے تھے۔

میں آج بھی گمبر میں رہ رہا ہوں۔ اس دن کے انتظار میں جب میرا بیٹا بچپن کی بھول بھلیاں سے نکل کر ہوش مندی کی دنیا میں قدم رکھے گا۔ یہ زخم دھیرے دھیرے میرے سینے کا ناسور بن رہا ہے کہ اب میں ڈینی نہیں، قمر علی ہوں!

(ختم شد)

Downloaded from https://paksociety.com